قراردادِ مقاصد (دستور پاکستان) اور اسرائیل کا اعلان آزادی

ڈاکٹر شہزاد اقبال شام*

In the 5th decade of the 20th century, two states Pakistan and Israel came into being on the basis of their religious dogmas viz., Islam and Judaism. Both the countries have a number of similarities, and out of those, but not exhaustive, their basic documents---Objectives Resolution and Proclamation of Independence respectively---have a remarkable significance, and are the central point of this discourse. The author, in this article, concluded that political, judicial and legal consensus of opinion in both the countries, unanimously have accepted that these basic documents fulfil the constitutional requirements of both the countries.

ابتدائیہ

لفظ ''نظریہ'' (Ideology) اور اس کے متعلقات وطن عزیز میں اسلامی نظریۂ حیات کے حوالے سے اس قدر پختہ مفاہیم اور معانی کے حامل بن چکے ہیں کہ عام قاری کا ذہن کوئی تحریر پڑھتے پڑھتے فوری ردِعمل کے طور پر اگر انہیں اسلام کا متبادل سمجھ لے تو اس پر کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ غالباً اس کی بڑی وجہ--- بلکہ ایک ہی وجہ--- یہی ہے کہ پاکستان کا نظریہ حیات اور مقصدِ وجود ہی اسلام ہے اور یہ تصور قیامِ پاکستان کے بعد اگر پختہ تر ہوا ہے تو یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ اس کی تخم ریزی اکابرِ تحریکِ پاکستان کی جملہ تحریروں اور تقریروں میں ہر جگہ بڑی قوت کے ساتھ ملتی ہے۔

یہ لفظ واقعتاً وہ لغوی معانی بہم نہیں پہنچاتا جن معنوں میں اہل زبان اسے استعمال کرتے ہیں اور اہل لغت جن معنوں میں اس کی تشریح وتوضیح کرتے ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے آئیڈیالوجی آف پاکستان کا بالعموم ایک ہی مفہوم لیا جاتا ہے اور وہ ہے اسلام! لیکن اسی لفظ کو امریکہ میں استعمال کرنے پر پہلے یہ سراغ لگانا پڑے گا کہ یہ کس پیرائے میں استعمال ہو رہا ہے۔ امریکی سیاسیات کے مفاہیم واضح کرتے کرتے امریکن آئیڈیالوجی کی اصطلاح استعمال کرنا ناگزیر ہو جائے تو اس کا ایک ہی مفہوم ہوگا--- آزادی! مطلقاً آزادی اور ہمہ جہت آزادی، نہ کہ اسلام!

یہ صورت حال ہر ملک کے حوالے سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ سری لنکا کا دستور دیکھئے، دستور پڑھنے کے بعد اس ملک کی آئیڈیالوجی کو ایک لفظ میں سمونے کی کوشش کی جائے تو جواب بدھ مت کی صورت میں آتا

* اسسٹنٹ پروفیسر، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ہے جس کے تحفظ کے لیے دستوری شقیں موجود ہیں۔(۱) علی ھذا القیاس۔ پاکستان میں یہ کیفیت ایک دولفظی نام ''قرارداد مقاصد'' (Objectives Resolution) میں سمو کر نظریہ پاکستان واضح کر دیا گیا ہے(۲)۔ اسرائیل کا مملکتی نظریہ اس کے اعلان آزادی (Proclamation of Independence) مجریہ ۱۹۴۸ء(۳) میں بڑی حد تک اور بعد میں پارلیمنٹ کے وضع کردہ قوانین بعنوان ''بنیادی قوانین''(۴) میں کافی حد تک دیکھا جاسکتا ہے۔

نظریہ ہی وہ جواز یا محور ہوا کرتا ہے جس پر ریاست کا مدار ہوتا ہے۔ کسی ریاست کا نظام تعلیم اس کے نظریے سے نمو پاتا ہے اور عدالتی فیصلے بھی اسی کی روشنی میں لکھے جاتے ہیں۔ تجارت، معیشت اور روزگار سے لے کر دفاع اور معاشرت تک ہر میدان میں یہ نظریہ ہی ہوا کرتا ہے جو ریاست کے وجود کو سہارا دیتا ہے۔ یہ سہارا کمزور ہو تو ریاست کا وجود لڑکھڑانا شروع ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ ضعف ریاست ہوا کرتا ہے۔

پاکستان کا نظام تعلیم مختلف الجہت اور ہمہ انتشار کیفیت کا مظہر ہونے کے باعث ویسے ہی نتائج کا حامل ہے جن کی توقع علت اور معلول کے قانون کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر یہ نشاندہی کافی ہے کہ وطن عزیز کا وہ بنیادی نظریہ جو قرارداد مقاصد کی شکل میں اس ملک کی اساس ہے، دین دار اور نظریاتی عنصر اگر اسے حرزِ جان قرار دیتا ہے تو لادین اور بے دین عنصر کے لیے یہ نظریہ ایک دل فگار چبھن سے کم نہیں ہے۔

دو نظریاتی ممالک: چند سوال

مذہبی اعتبار سے دنیا میں دو نظریاتی ریاستیں --- پاکستان اور اسرائیل --- گزشتہ صدی کے پانچویں دہے میں قائم ہوئیں۔ حوصلہ افزا امر یہ ہے کہ اسرائیل کی مسلم کش پالیسی کے سبب وطن عزیز کا مذہبی عنصر ہی نہیں، لادین عنصر بھی اسرائیل کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتا۔ پاکستان کے لادین عنصر کا تجزیہ کیا جائے تو یہ کہنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس طبقے کی ایک بڑی اور غالب تعداد اگر مذہب کو ریاستی امور میں بے تعلق دیکھنا چاہتی ہے تو حوصلہ افزا امر یہ ہے کہ اس طبقے کے لوگ اعتقادی حد تک مطلقاً اور عملی طور تک بڑی حد تک مسلمان ہیں اور اپنی شناخت ایک مسلمان کے طور ہی پر کرانے پر اصرار کرتے ہیں۔ اس طبقے کے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین افراد پر مشتمل ایک قیمتی اثاثہ ہے جسے نشان راہ مل جائے تو یہ لوگ راہبر و منزل بننے کی اہلیت بھی رکھتے ہیں۔

اس مقالے کے مخاطب بنیادی طور پر یہی وہ جدید پڑھے لکھے اور کسی حد تک بدقسمتی سے عاقبت

نااندیش لوگ ہیں۔ سطور پیش آئیندہ میں کوشش کی جائے گی کہ اسرائیل اور پاکستان کے اساسی قوانین ---قراردادِ مقاصد اور اعلان آزادی و بنیادی قوانین--- کا موازنہ کیا جائے اور اہل علم کے سامنے دنیا میں نظریے بلکہ مذہبی نظریے کی بنیاد پر قائم ایک اور ریاست کا احوال رکھا جائے جس سے انہیں اندازہ ہو سکے کہ پاکستان کا دستوری نظریہ یعنی قراردادِ مقاصد کوئی ایسی بے وقعت شے نہیں جسے مذہبی عناصر سے نتھی کیا جائے (حالانکہ مجلس دستور ساز میں اس کے محرک جناب لیاقت علی خان کی شناخت کسی بھی زاویے سے مذہب کے حوالے سے ہرگز نہیں تھی)۔

مقالے کی ابتدا میں یہ مطالعہ پیش نظر ہے کہ پاکستان کی قراردادِ مقاصد کے متوازی اسرائیل میں دستور نہ ہونے کے باوجود کس دستاویز کو فوقیت حاصل ہے۔ اس دستاویز کی مذہبی و دستوری حیثیت کیا ہے؟ اسی طرح پاکستان کی قراردادِ مقاصد کا جائزہ نظریہ پاکستان کے حوالے سے لے کر کوشش کی جائے گی کہ مذہبی بنیادوں پر قائم ان دونوں نظریاتی ریاستوں میں کیا عناصر مشترک ہیں۔ آخر میں اہل علم اور فہمیدہ طبقے کے لیے یہ سوال بغرض تفکر چھوڑ دیا جائے گا کہ یہودی نظریے (اعلان آزادی) پر قائم کسی نظریاتی مملکت کی بقا کے لیے دنیا بھر کے یہودی اور لادین عناصر اگر متحد ہو کر اسے (اعلان آزادی) تقویت دے رہے ہیں تو مسلم نظریے (قراردادِ مقاصد) کی مخالفت کرنے والے وطن عزیز کے نادان عناصر کے پیش نظر کیا ہے۔ ذرا سوچئے! افلا تتفکرون؟

پاکستان اور اسرائیل: مماثلت و موازنہ

ان دونوں نظریاتی ممالک میں حیرت انگیز مماثلت یہ ہے کہ یہ دونوں محض ۹ ماہ کے فرق کے ساتھ ایک ہی عہد میں معرض وجود میں آئے۔ پاکستان ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء مطابق ۲۷ رمضان المبارک کو وجود میں آیا تو اسرائیل کا قیام عبرانی تقویم کے آٹھویں ماہ (Iyar) مطابق ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو عمل میں آیا (۵)۔ پاکستان کے قیام کی پہلی باقاعدہ سیاسی اینٹ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے جلسہ عام میں رکھی گئی جس کا ثمرہ کوئی سوا سات سال بعد قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء کے اجرا پر دیکھنے کو ملا (۶)۔ اسرائیل کے قیام کی ابتدا انیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں دنیا کے مختلف حصوں سے جم غفیر (لیکن احتیاط اور تدریج) کی صورت میں یہودیوں کی ارضِ فلسطین میں آمد پر ہو چکی تھی۔ تاہم اس کا باقاعدہ سیاسی وجود یہودیوں کی پیپلز کونسل کے اعلان آزادی (Proclamation of Independence) کے بعد دیکھنے میں آیا۔ اسی اعلان آزادی کے نتیجے میں اسرائیل کی عبوری حکومت قائم ہوئی (۷)۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے ۱۹۴۹ء میں ایک

قرارداد کے ذریعے بنیادی اصولوں کی کمیٹی تشکیل دی، تو اسرائیل کی اسمبلی نے ۱۹۵۰ء میں بنیادی قوانین مرتب کرنے کے لیے کمیٹی قائم کی۔

دونوں ممالک کی مجالس دستور ساز طویل عرصے تک اپنا اپنا اولیں وظیفہ --- دستور سازی --- سرانجام دینے میں ناکام رہیں۔ متحدہ ہندوستان میں ۱۹۴۶ء کے انتخابات سے پیدا شدہ اسمبلی کے وہ ارکان جن کے حلقہ ہائے انتخاب جغرافیائی طور پر پاکستان کا حصہ بنے، بحیثیت کل پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی قرار پائے (۸)۔ یہ اسمبلی سات سال کی طویل مدت کے بعد ایک دستوری مسودہ منظور کرنے میں کامیاب ہوئی تو سربراہ مملکت نے اس مسودے کی منظوری (Assent) دینے کی بجائے اسمبلی تحلیل کر دی اور یوں ملک میں دستوری خلا ۱۹۵۶ء تک باقی رہا۔ اسرائیل میں دستور سازی کے لیے عبوری حکومت کے ابتدائی ایام ہی میں طے ہو گیا کہ یہ کام یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء تک طے کر لیا جائے گا (۹)۔ لیکن دستور ساز اسمبلی کا انتخاب بجائے خود ۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء کو ہوا (۱۰)۔ تادم تحریر اسرائیل میں کوئی دستور نہیں بنا اور نہ وہاں کوئی ایسی سوچ (Move) موجود ہے جس کی خاطر دستور سازی کی مشق ناگزیر ہو جائے۔

کیا اسرائیل میں برطانیہ کی طرح پارلیمانی بالادستی (Supermacy of Parliament) وہاں کی سیاسیات کا سنگ میل ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ اسرائیل جمہوری دنیائے سیاسیات میں ایک اچھوتی مثال ہے۔ اس ملک کا تحریری دستور نہیں ہے۔ اس ملک میں پارلیمان (Knesset) تو موجود ہے لیکن دستور نہ ہوتے ہوئے بھی یہاں پارلیمانی بالادستی کا وہ تصور نہیں ملتا جو برطانیہ کی شناخت بن چکا ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پارلیمان کے کسی قانون کے صحیح اور غلط ہونے کا مقیاس (Yard stick) کیا ہے۔ عدالتیں کس بنیاد پر ریاستی اداروں میں توازن رکھتی ہیں؟

اسرائیل کا دستوری محور: اعلان آزادی

ان سوالوں کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں اسرائیل کی پارلیمانی تاریخ کے ابتدائی دو تین سال کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا۔ اسرائیلی ریاست قائم ہوئے ہی ملک میں ایک دستوری بحث کا آغاز ہوا۔ ایک نقطہ نظر کے حاملین کا خیال یہ تھا کہ اعلان آزادی ۱۹۴۸ء ہمارا دستور ہے اور مملکت چلانے کے لیے اس میں مندرج اصول ریاستی سیاسیات کے لیے کافی ہیں۔ یہ خیال دونوں قسم کے بعض لوگوں کا تھا جن کی شناخت لادین (Secular) اور مذہبی عناصر کے طور پر تھی۔ ادھر یہ اعلان آزادی ان کے ماہرین سیاسیات چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اسرائیلی سپریم کورٹ نے اپنے ایک سے زائد فیصلوں میں اس اعلان آزادی کے ان چار

حصوں کے متعلق الگ الگ فیصلے دیے۔ اعلان آزادی کے یہ چار حصے کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ اس کے پہلے حصے میں قوم یہود کی تاریخ، اپنی سیاسی شناخت کے لیے اس کی جدوجہد اور اس حق کے لیے عالمگیر اعتراف کا ذکر ہے۔

۲۔ دوسرے حصے میں ریاست کی عملی تشکیل کا بیان ہے۔

۳۔ تیسرے حصے میں مملکت اسرائیل کے راہنما اصولوں کا بیان ہے۔

۴۔ آخری حصہ اقوام متحدہ، ریاست کے عرب باشندوں اور عرب ممالک سے دست تعاون دراز کرنے اور امن اور چین کے ساتھ رہنے اور دنیائے یہود (Diaspora) سے مملکت میں مہاجرت کی اپیل سے عبارت ہے۔

اسرائیلی سپریم کورٹ کے سامنے اعلان آزادی کی قانونی حیثیت متعین کرنے کا سوال جب ایک سے زائد مرتبہ آیا تو عدالت نے اس کا پہلا اور تیسرا حصہ قوانین کی تعبیر وتشریح کے لیے ایک مرکزہ قرار دیا۔ تاہم سپریم کورٹ نے اس اعلان کو کوئی دستوری حیثیت دینے سے ہمیشہ گریز کیا اور کہا کہ پارلیمان کے کسی قانون کی حیثیت متعین کرنے میں اس کی کوئی دستوری حیثیت نہیں ہے (۱۱)۔ جس کے لیے پارلیمان کو قوانین وضع کرنا پڑے۔ ان قوانین کی تعبیر وتشریح کی ضرورت پڑی تو سپریم کورٹ نے پھر اعلان آزادی کے پہلے اور تیسرے حصے سے رجوع کیا۔

سپریم کورٹ کے ان فیصلوں کو اسرائیل سے باہر لے جا کر پڑھا جائے تو ان کی روشنی میں اعلان آزادی ۱۹۴۸ء کی مذہبی ونظریاتی حیثیت دھندلاہٹ کا شکار ہوتی نظر آتی ہے۔ اعلان آزادی پر دستخط کرنے والے افراد ہی تحریری دستور کے حق میں تھے۔ دوسری طرف یہ لوگ زیادہ سیکولر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ اس طرح بظاہر دو باتیں بیک وقت نظر آتی ہیں:

۱۔ یہ کہ اعلان آزادی کی وہ دستوری حیثیت نہیں جو مذہبی عناصر کو مطلوب تھی، اور

۲۔ یہ کہ سیکولر عناصر، مذہبی عناصر کے مقابلے میں بظاہر فتح یاب ہو گئے۔

اسرائیلی مذہبی عناصر کا نقطۂ نظر

ایک ایسی صورت حال جس میں مملکت کی ایک مقدس اور بنیادی دستاویز کو سپریم کورٹ کلیتاً دستوری قرار نہ دے، بدیہی طور پر مذہبی عناصر کو فوراً ایک مذہبی دستور کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے تھی تاکہ سپریم کورٹ کو اس طرح کے ''سیکولر'' فیصلوں سے آئندہ روکا جائے۔ لیکن ایسے نہیں ہوا۔ کٹر مذہبی عناصر نے ڈیوڈ بن

گوریان کی قیادت میں جمع ہو کر شدت کے ساتھ تحریری دستور کی مخالفت شروع کر دی۔ حالانکہ بظاہر یہ بات حکمت کے خلاف تھی۔

ان مذہبی عناصر نے سپریم کورٹ کے فیصلوں کے وہ حصے لیے جن کے تحت اعلان آزادی کا پہلا اور تیسرا حصہ پارلیمان کے وضع کردہ قوانین کی تعبیر وتشریح مناسب قرار پائے تھے۔ انہوں نے یوں تو تحریری دستور کی مخالفت میں کئی دلائل دیے لیکن ان کی ایک دلیل برہان قاطع کے طور پر استعمال ہوئی اور ابھی تک موثر ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ مملکت اسرائیل دنیا بھر کی قوم یہود کی ایک پناہ گاہ (Refuge) ہے۔ اس پناہ گاہ میں فی الوقت پوری قوم کی ایک محدود اقلیت داخل ہو پائی ہے۔ یہ محدود اقلیت ایک اعتبار سے مملکت سے باہر مقیم لوگوں پر ایک گونہ فوقیت رکھتی ہے کہ وہ نامساعد حالات میں ان کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر رہی ہے۔ لیکن کل تک یہ اقلیت بھی بَن باس کا شکار تھی۔ آج اگر یہ لوگ فرزندانِ یہود کے دیگر ارکان سے ذرا پہلے مملکت میں داخل ہو گئے ہیں تو انہیں یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ مملکت سے باہر مقیم اس کے پشتینی ''شہریوں'' کے لیے وہ دستوری اگر ہیں لگانا شروع کر دیں جو کل کو باہر مقیم قوم یہود کے افراد کے لیے نامناسب ہوں۔ پس قوم یہود کے تمام شہریوں کی اجتماعی خواہش کے بغیر کوئی دستور نہیں بنایا جا سکتا۔ اب چونکہ مملکت کے شہریوں کی اکثریت ابھی تک مملکت سے باہر مقیم ہے اور فی الوقت ان کی طرف سے رائے دہی کا کوئی میکنزم موجود نہیں ہے، اس لیے مملکت کی جغرافیائی حدود میں قدرے پہلے آ جانے والوں کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اپنی ہی قوم کے لوگوں کے لیے ایسے اصول وضع کریں جو ممکنہ طور پر ان کو ناپسند ہو سکتے ہیں (۱۲)۔

یہاں پر یہ وضاحت ناگزیر ہے کہ لادین عناصر کوئی عالم گیر وحدت نہیں ہے۔ ترقی یافتہ مغربی ممالک میں کسی حد تک اس اصطلاح کا جو پاکیزہ مفہوم لیا جاتا ہے، ترکی کی سیاسیات میں اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے بلکہ ایک اعتبار سے یہ مذہب دشمنی کے مفاہیم میں لتھڑا ہوا ہے۔ بھارت کا دستور لادینیت کی مالا جپتا نظر آتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی کسی بھی زاویے سے اس کا مطالعہ کر لیا جائے، ہندو قوم کی ژولیدہ فکری ہی اس کا نقطہ ماسکہ ہے۔ پاکستان میں یہ دونوں تصورات --- مغربی تصور لادینیت اور ترکی تصور لادینیت --- ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت کرتے نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ موقع کی مناسبت سے مذہبی عناصر سے بھی بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اسرائیل میں لادینیت کا مفہوم صرف قوم یہود کے مالہٗ کے دائرے میں رہتے ہوئے ہے۔ اسرائیل کے تناظر میں جب لادینیت کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو اس کی لادینیت کا کوئی تعلق بیرونِ قومِ یہود نہیں ہوتا۔ اور نہ اسے اسرائیل کے اندر مقیم قوم یہود کی حد تک محصور کیا جا سکتا ہے۔

بالفاظ دیگر اسرائیلی لادینیت قوم یہود کے داخلی تناظر میں ہے جس کی نہ تو جغرافیائی حد بندی ممکن ہے اور نہ اس کی تشکیل میں جغرافیائی حدود کے ساتھ قائم مملکت اسرائیل میں مقیم دیگر قومیتوں --- جیسے فلسطینی --- کی آرا کو دخل ہے۔ قوم یہود کی لادینیت عالم گیر سطح پر اس قوم کے مفادات کی لادینی تعبیر وتشریح سے عبارت ہے۔ اس لادینی عمل میں بھی مذہبی عناصر کو الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔

ہر چند کہ تحریری دستور کے لادین موئدین کے دلائل بھی کچھ کم توانا اور کم طاقت ور نہ تھے تاہم ڈیوڈ بن گوریان جیسے قائد کی اقتدا میں تمام مذہبی عناصر کے سامنے لادین عناصر کی رائے پذیرائی حاصل نہ کر سکی۔ لیکن ۲۵ ماہ کے طویل مباحثے کے بعد پروگریسو پارٹی کے رکن پارلیمان مسٹر ہرارے (Harari) کی قرارداد کو اسرائیلی پارلیمان نے بالآخر ۱۳ جون ۱۹۵۰ء کو اختیار کر لیا۔ اس قرارداد کے تحت پارلیمان کی قائم کردہ کمیٹی بعنوان ''دی کانسٹی ٹیوشن، لا اینڈ جسٹس کمیٹی'' کو یہ وظیفہ سونپا گیا کہ دستور کے الگ الگ ابواب تیار کر کے جداگانہ قانون کے طور پر پارلیمان کے سامنے بغرض منظوری لائے اور اپنے طور پر علیحدہ علیحدہ یہ تمام ابواب مل کر دستور کہلائیں گے۔ (۱۳)

اس تجویز پر عمل شروع ہوا تو معلوم ہوا کہ یہاں بھی پاکستان اور اسرائیل میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ پاکستان نے اپنے قیام سے آٹھ سال بعد دستور وضع کیا تو اسرائیل میں اس کے دستور کا پہلا باب متعلق بہ پارلیمان ابتدائی فیصلے کے آٹھ سال بعد منظور ہوا۔ یوں اسرائیل کے قیام ۱۹۴۸ء سے لے کر یا کم از کم قرارداد ہرارے کی ۱۹۵۰ء میں منظوری سے تا ایں دم اسرائیل میں چودہ ''بنیادی قوانین'' منظور ہوئے۔ ان میں سے تین بنیادی قوانین کو ان کے مابعد والے بنیادی قوانین نے منسوخ کر دیا اور یوں اس وقت اسرائیل میں آخری بنیادی قانون مجریہ ۲۰۰۱ء سمیت کل گیارہ بنیادی قوانین موجود ہیں (۱۴)۔

اسرائیلی بنیادی قوانین پر نئی بحث

قرارداد ہرارے میں طے پایا تھا کہ پارلیمان کی کمیٹی دستور کے الگ الگ ابواب بعنوان بنیادی قانون (Basic Law) تیار کرے گی۔ پارلیمان نے یہ قوانین دیگر تمام قوانین کی منظوری دینے کے عمومی طریق کار کے مطابق یعنی سادہ اکثریت سے منظور کیے۔ گویا پارلیمان نہ تو دستور ساز کہلایا اور نہ اس نے یہ متفرق دستوری ابواب دستوری طریقے کے مطابق منظور کیے۔ اس کے نتیجے میں ملک کے اندر ایک نئی بحث کا آغاز ہوا: کیا بنیادی قوانین دستور ہیں بھی یا نہیں؟ اگر یہ دستور ہیں تو ان میں سے تین قوانین کو کم وبیش دنیا بھر کے مسلمہ طریق کار --- دو تہائی اکثریت --- سے منسوخ کیوں نہ کیا گیا اور ان کی جگہ نئے بنیادی قوانین

لاتے وقت یہ طریقہ کیوں اختیار نہیں ہوا؟ لہٰذا یہ بنیادی قوانین دستوری حیثیت کے حامل نہیں ہیں۔ اس کا جواب یہ آیا کہ ۱۹۵۰ء میں قرارداد ہرارے میں پارلیمان نے ان بنیادی قوانین کی حیثیت متعین کر دی تھی جس کے تحت یہ دستور ہیں۔

اس گفتگو سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک الجھی ہوئی اور بظاہر لاینحل بحث ہے جس کے سرے کا سراغ لگانا ماہرین دستور کے بس میں نہیں ہے۔ دوسری طرف یہ بھی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں حکومتیں تو آتی جاتی رہتی ہیں، پارلیمان میں بحث مباحثہ بھی اپنی روایات کے مطابق ہوتا رہتا ہے لیکن اس حقیقت کے باوجود اسرائیل میں یہ دستوری بحران کبھی پیدا نہیں ہوا کہ سیاسی اعتبار سے اس ملک میں پارلیمانی بالادستی ان معنوں میں نہیں ہے جن سے برطانوی پارلیمان مزین ہے۔ دستور اس ملک میں ابھی تک موجود نہیں ہے اور جس شے کو دستور کہا جانا چاہیے اس پر بھی دو متضاد آرا بن چکی ہیں۔ ان حالات میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ عدالتیں دستوری مسائل کیسے حل کرتی ہیں۔ اسرائیل کی سیاسی و دستوری تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوئی، سپریم کورٹ اپنے سابقہ فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے اعلان آزادی سے رجوع کرتی ہے اور اس کے پہلے اور تیسرے حصے سے روشنی لے کر پارلیمان کے وضع کردہ قوانین کی دستوری حیثیت متعین کر دیتی ہے۔

اس اعتبار سے اسرائیل کے اعلان آزادی کی حیثیت تو وہی ہے جو پاکستان میں قرارداد مقاصد کو حاصل ہے لیکن پاکستان کے برعکس یہ اعلان دستور کی سی حیثیت بھی رکھتا ہے۔

پاکستان کا دستوری محور: قراردادِ مقاصد

تقسیم ہند کا نتیجہ دو آزاد ممالک، ہندوستان اور پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔ قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء میں طے پایا کہ یہ دو ریاستیں تاج برطانیہ کے سیاسی غلبے سے مطلقاً آزاد ہوں گی۔ ان کی دستور ساز اسمبلیاں اپنی اپنی حدود کے لیے دستور تیار کریں گی۔ دستور تیار ہونے تک ان کا نظام گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت چلایا جائے گا (۱۵)۔ پاکستان کے برعکس ہندوستان مستحکم بنیادوں پر قائم ملک تھا۔ ملک تقسیم ہونے کے باوجود اسے ان مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑا جو پاکستان کو درپیش تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے دو سال سے کم عرصے میں اپنا دستور تیار کر لیا۔ پاکستان میں یہ کوشش طول پکڑتی گئی۔ تاہم دستور کی بجائے ۱۹۴۹ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان نے دستور ساز اسمبلی میں ایک قرارداد بعنوان ''قراردادِ مقاصد'' منظوری کے لیے پیش کی جس کی تائید مولانا شبیر احمد عثمانی نے کی۔ چھ دن کی بحث کے بعد یہ قرارداد من وعن

اختیار کر لی گئی۔ اس دستوری مشق کے نمایاں خدوخال یوں بیان کیے جا سکتے ہیں (۱۶):

۱۔ تمام کائنات پر اللہ رب العزت کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرتے ہوئے جمہور کے منتخب نمائندوں کو مقدس امانت کے طور پر اختیارات استعمال کرنے کا اہل قرار دیا گیا۔

۲۔ آئندہ مرتب کیے جانے والے دستور میں جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدل عمرانی کے اصول، اسلام کی تشریح کے مطابق ہوں گے جن کے تحت مسلمانوں کو ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی، تعلیماتِ اسلام اور اسلامی تقاضوں کے مطابق گزارنے کے قابل بنایا جائے گا۔ اقلیتیں اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کر سکیں گی۔

۳۔ بنیادی حقوق کی ضمانت، قانون اور اخلاق عامہ سے مشروط ہوگی۔

۴۔ اس قرارداد کی منظوری کے ساتھ ہی ملک کے نظریے کی تشکیل عمل میں آ گئی کیونکہ اسمبلی میں موجود جملہ ۱۰ غیر مسلم ارکان نے اس کی مخالفت اور تمام ۲۱ مسلمان ارکان نے اس کی حمایت میں ووٹ دیا۔ مارکسی راہنما میاں افتخار الدین نے ایک اعتبار سے اس کے حق میں تقریر کی جس کا محور غیر مسلموں کو اطمینان دلانا تھا لیکن مارکسی فکر سے اس قرارداد کی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث رائے شماری کے وقت وہ اسمبلی سے غیر حاضر ہو گئے۔

۵۔ یہ وہ واحد قرارداد ہے جس کے حق میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے تمام مسلمان ارکان اس کے حق میں اور تمام غیر مسلم ارکان اس کی مخالفت میں جمع ہو گئے۔ گویا یہ اتحاد و انتشار مذہبی تھا، نہ کہ سیاسی وابستگی کی بنیاد پر تھا۔

۶۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ مغربی ملکوں اور سوویت یونین دونوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے نظام حکومت جمہوریت پر استوار ہیں، حالانکہ ان کی سیاسیات ایک دوسرے سے مطلقاً مختلف ہے۔ اسی طرح جب ہم لفظ جمہوریت استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد ہمارا اپنا نظام حکومت اور معاشرہ ہے اور یہ کہ اسلام نسل، رنگ یا قومیت کی بنیاد پر کسی تفریق کو تسلیم نہیں کرتا (۱۷)۔

قراردادِ مقاصد: مقننہ کا مثبت کردار

یہ کہنا خاصا دشوار ہے کہ قراردادِ مقاصد میں مذکور راہنما اصولوں کا رنگ ۱۹۵۶ء کے دستور میں کس قدر تھا، تاہم اس دستور میں قراردادِ مقاصد اپنی محرف شکل میں شامل ہوئی۔ یہ دستور نہ چلا اور مارشل لا حکومت نے نیا دستور تیار کرنے کے لیے جناب شہاب الدین کی سربراہی میں ایک دستوری کمیشن قائم کیا۔ اس کمیشن نے

اپنا کام بڑے سائنسی انداز میں مکمل کیا۔ کمیشن نے ایک سوالنامہ وضع کیا جس ایک سوال یوں تھا،'' کیا نئے دستور میں سابقہ دستور [۱۹۵۶ء] کا دیباچہ [قراردادِ مقاصد] شامل کرنا ضروری ہے؟ اس سوال کے جواب میں ۹۶ء۶ فی صد رائے دہندگان نے اثبات میں جواب دیا (۱۸)۔ اس طرح قراردادِ مقاصد ۱۹۶۲ء کے دستور میں بھی اپنی محرف شکل میں بطور دیباچہ شامل رہی (۱۹)۔ اسی کے تسلسل میں جب مارشل لا حکومت کی اپنی منتخبہ اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو خود سرکاری بنچوں کی طرف سے قوانین کو اسلامیانے کا مطالبہ ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں آ گیا۔ صرف نمونے کے طور پر ایک رکن اسمبلی، مرکزی وزیر اور بظاہر مغرب زدہ سیاسی راہنما جناب ذوالفقار علی بھٹو کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> ......پالیسی اصولوں کی مطابقت میں دستور بالوضاحت یہ قرار دیتا ہے کہ پاکستان کے مسلمان انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قابل ہوں کہ اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے تحت زندگی گزاریں...... وہ اسلام کے اخلاقی معیارات کو فروغ دیں اور ان کی پاسداری کریں۔ اسی طرح زکوٰۃ، وقف اور مساجد کو باقاعدہ ادارہ جاتی طور پر یقینی بنایا جائے (۲۰)۔

یہ یاد رہنا چاہیے کہ یہ بھٹو صاحب نہ تو پیپلز پارٹی کے راہنما تھے اور نہ متوقع وزیر اعظم، یہ حیثیتیں تو انھیں برسوں بعد جا کر حاصل ہوئیں۔ ۱۹۷۳ء کے دستور میں قراردادِ مقاصد اپنی اصل شکل میں بطور دیباچہ شامل تھی۔ دستور سازی کے عمل میں دستوری بحثیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے حق اور مخالفت میں جو ماحول ایوان کے اندر تھا، اس میں بعد المشرقین ہرگز نہیں تھا بلکہ اس کے بین السطور میں صاف نظر آتا ہے کہ سیاسی حلقے دستوری شقوں کی قوت وضعف کی سودے بازی میں لگے ہیں۔ دینی حلقے اسے دستور کا قابل عمل (Substantive) حصہ قرار دینے پر مصر تھے تو سرکاری بنچ اسے محض دیباچہ قرار دینے کے لیے کوشاں تھے۔ بالآخر انارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار نے ان الفاظ میں بحث سمیٹی:

> جناب اگر آپ دستور کا دیباچہ ملاحظہ فرمائیں تو آپ دیکھیں گے کہ نظریہ پاکستان کو دیباچے کی پہلی سطر میں تقدس دے دیا گیا ہے۔ یہ دستور تسلیم کرتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کو سزاوار ہے جسے لوگ اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے اس کی مقررہ حدود میں رہ کر استعمال کرتے ہیں۔ یہ ہے اس کا تصور اقتدار اعلیٰ! یہ ہے اسلام کا تصور دستور جسے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اللہ کی مقررہ حدود کے متعلق معمولی اختلاف موجود ہے (۲۱)۔

۱۹۷۹ء کے مارشل لا کے عرصے میں ۲۴ دستوری ترامیم (۲۲) کو بالآخر آٹھویں دستوری ترمیم سے

موسوم ایک ترمیم ۱۹۸۵ء کے پارلیمان نے منظور کرلیا جس کے تحت قراردادِ مقاصد کو دیباچے کی سطح سے اٹھا کر اسے دستور کے قابل عمل (Substantive) حصے میں بطور آرٹیکل ۲۔الف شامل کرلیا گیا۔اس کے بعد وقفے وقفے سے چھ اسمبلیاں قائم ہوئیں لیکن اس قرارداد کی موجودہ حیثیت قائم ہے۔حتیٰ کہ ۲۰۱۰ء میں ۱۹۷۳ء کے بعد بہت ہی بڑے پیمانے پر اور ۱۹۷۳ء جیسے سیاسی اتفاق رائے سے کثرت کے ساتھ دستوری شقوں میں ترامیم (بعنوان اٹھارویں ترمیم) تو ہوئیں لیکن قرارداد مقاصد کے مرتبے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔

قراردادِ مقاصد اور عدلیہ

۱۹۶۹ء میں فوجی حکومت قائم ہونے پر عدالتی چارہ جوئی کی گئی۔دوران بحث میں ۱۹۵۸ء کی طرح ہانس کیلسن کے نظریات کا سہارا لینے کی کوشش ہوئی تو عدالت نے واضح الفاظ میں اس سوچ کی تردید کی اور قراردادِ مقاصد کو ملکی قانون کے لیے بنیادی سرچشمہ قانون (Grund norm) قرار دیا۔عدالت کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> جب کبھی ہمیں کسی بنیادی سرچشمہ قانون کی ضرورت پڑی تو اس کی تلاش کے لیے مجھے قانون سے متعلق مغربی نظریہ سازوں سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے اپنے بنیادی سرچشمہ قانون کو ہمارے نظریے میں تقدس حاصل ہے کہ تمام کائنات پر قانونی اقتدار اعلیٰ صرف اللہ ہی کو سزاوار ہے اور اس کی متعین کردہ حدود میں رہ کر استعمال کیے جانے والے اختیارات ایک مقدس امانت ہیں۔یہ ایک غیر متبدل اور ناقابل تغیر سرچشمہ ہے جسے ۷[۱۲] مارچ ۱۹۴۹ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی سے منظور قراردادِ مقاصد میں صراحتاً قبول کرلیا گیا تھا (۲۳)

یہ نمونے کے ایک فیصلے کا اقتباس ہے۔یہ فیصلہ اس وقت کا تھا جب نہ تو ملک میں دستور تھا اور نہ قرارداد مقاصد گزشتہ دستور کا قابل عمل حصہ تھی۔اس کے باوجود عدالت نے اسے ملکی قانون (بشمول دستور کیونکہ دستور موجود نہیں تھا) کے لیے بنیادی سرچشمہ قانون قرار دینے میں تامل نہیں کیا۔۱۹۸۵ء میں جب یہ قرارداد آرٹیکل ۲۔الف کے طور پر دستور میں شامل ہوئی تو اس کی بنیاد پر کثرت کے ساتھ عدالتی فیصلے آنے لگے۔جن کا خلاصہ یہی ہے کہ اس قرارداد کو پاکستان کے دستوری ڈھانچے میں محور کی حیثیت حاصل ہے۔

پاکستان کے سیاسی نظام میں قراردادِ مقاصد کا مرتبہ ومقام

دستور اگر ملکی قوانین کے لیے راہنما اصول دیتا ہے تو دستور کو راہنما اصول دینے کے لیے

قراردادِ مقاصد موجود ہے۔ اگر بادی النظر میں کسی قانون کا دستور سے تعارض دیکھنے کو ملے تو عدالتیں دستور کو فوقیت دیا کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام قانون سازی دستوری اصولوں کی روشنی میں ہونا بدیہی امر ہے۔ بعینہٖ اگر کسی وقت دستور اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ نظر نہ آئے تو قراردادِ مقاصد کا وجود ظاہر کرتا ہے کہ اس کی بنیاد پر خود دستور کو بھی چیلنج کیا جا سکتا ہے کہ دستور کی فلاں فلاں شقیں اس قرارداد کے فلاں حصے سے متعارض ہیں۔ یہی سپریم کورٹ کے فیصلے مجریہ ۱۹۷۲ء کی روح ہے۔ اگرچہ یہ صورت حال پاکستان میں ابھی تک پیدا نہیں ہوئی کیونکہ تینوں ملکی دساتیر میں یہ قرارداد قوت وضعف کی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہی۔ لیکن اگر کبھی ایسی صورت حال پیدا ہوگئی کہ کسی کو خود دستور کا کوئی حصہ خلاف قرارداد دکھائی دیا تو اس کی بنیاد پر عدالتی چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ (۲۴)

اس قرارداد میں ملکی دستور کے راہنما اصول متعین ہو گئے۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے متفقہ ووٹوں سے منظور یہ قرارداد تینوں ملکی دساتیر کا حصہ رہی۔ فوجی حکومت کی طرف سے دستور میں اس کی شمولیت پر ۱۹۸۵ء کی اسمبلی نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے چھ اسمبلیوں نے اسے دستور کے مستقل حصے کے طور پر برقرار رکھا۔ موجودہ دستور بنتے وقت پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والے چوٹی کے دو دماغ، وزیر قانون جناب عبدالحفیظ پیرزادہ اور اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار نے اس قرارداد کی دستور میں شمولیت کا بڑے فخر سے تذکرہ کیا جس کا ذکر سطور متذکرہ بالا میں ہو چکا ہے۔ حتیٰ کہ تمام پارلیمانی جماعتوں کے اتفاق رائے سے موجودہ اٹھارویں ترمیم مجریہ ۲۰۱۰ء میں دستور کے اندر جہاں بڑی بڑی جوہری تبدیلیاں کی گئیں، وہیں اس قرارداد کے مرتبے اور مقام کو ذرہ برابر نہیں چھیڑا گیا۔

خلاصۂ کلام

اس بحث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سیاسی، قانونی، عدالتی، مذہبی حتیٰ کہ بزعم خویش کسی حد تک لادین عناصر کے طور پر مشہور افراد سمیت، تمام فہمیدہ طبقوں کے نزدیک یہ قرارداد کوئی ایسی بے وقعت سے نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کیا جائے۔ یہ دستاویز آج تقدس کے جن متبرک تصورات میں لپٹی نظر آتی ہے، ان تصورات کو دانش مند افراد کے دل و دماغ میں جگہ دلانے میں معاشرے کے تمام طبقوں کا حصہ ہے۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس دستاویز پر قومی اتفاق رائے ہے اور عدالت عظمیٰ کے الفاظ میں یہ سرچشمہ قانون (Grund norm) ہے تو کسی کو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

ایک سُلگتا ہوا سوال

لیکن اس وطن عزیز کے باشندوں کی بدقسمتی ہے کہ ہر دور میں ایک نہایت ہی معمولی، موثر، ذہین لیکن عاقبت نااندیش اقلیت کے دل میں اس مقدس دستاویز کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا ہے۔ ایسے افراد کی تقسیم کئی زمروں میں کی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ کبھی کبھار پارلیمان کے اندر گل افشانی کرتے نظر آتے ہیں۔ گاہے کسی علمی مجلّے میں بھی اس پر منفی انداز میں کچھ نہ کچھ دیکھنے کو ملتا رہتا ہے۔ صحافی حضرات اکثر و بیشتر اس قرارداد پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ تفصیل میں جائے بغیر نمونے کی صرف ایک تازہ ترین تحریر ملاحظہ ہو:

> ضیا نے ہی قراردادِ مقاصد ایک ایگزیکٹو آرڈر کے ذریعے آئین کا لازمی حصہ بنایا جس کی عملی افادیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ آئینی دستاویز پر غیر ضروری الفاظ کا بوجھ ڈال گیا ہے، ان الفاظ کا پالیسی امور سے سرے سے کوئی واسطہ نہیں۔ (۲۵)

فاضل کالم نگار محض صحافی نہیں، نظریہ پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کے ٹکٹ پر ۲۰۰۸ء کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔ تماشا تو یہ ہے کہ پوری قوت اور دلائل و براہین کے ساتھ یہ قرارداد پیش کرنے والے قائد ایوان جناب لیاقت علی خان مسلم لیگی، اس کے منظور کرنے والے تمام کے تمام ارکان مسلمان اور مسلم لیگی، اور مخالفت کرنے والے سب کے سب غیر مسلم تھے۔ تفصیل سے قطع نظر ۱۹۷۳ء کے دستور کی منظوری کے وقت جناب ظفر احمد انصاری نے ایوان کے اندر اس قرارداد کو دستور کے اندر شامل کرانے پر بہت زور دیا جو مسلم لیگی ہی نہیں، قائداعظم اور لیاقت علی خان کے ساتھی اور تحریک پاکستان کے مرکزی راہنماؤں اور مسلم لیگ کے مرکزی عہدے داروں میں سے تھے۔

اب مسلم لیگ کے بارے میں یہ کہنا خاصا مشکل کام ہے کہ وہ اپنے اساسی نظریات ترک کر چکی ہے لیکن زیر نظر اقتباس پڑھ کر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ کی صفوں میں غیر مسلم لیگی لوگ تشریف فرما ہیں۔ تاہم یہ ایک الگ موضوع ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ کوئی اور صاحب اس پر تحقیق کریں گے۔ موجودہ بحث کے نتیجے میں واضح ہو چکا ہے کہ اسرائیل میں دستور کی عدم موجودگی میں اولاً اس کے اعلان آزادی کے کچھ حصوں کو دستوری تشریح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ آج ۶۲ سال بعد بھی دستور کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ جہاں خلا دیکھنے کو ملے وہ بنیادی قانون کو دستور قرار دیتے ہیں۔ اس کی تعبیر و تشریح کی ضرورت پڑے تو پھر اعلان آزادی کی طرف دیکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو جائے اپنی اساسی دستاویز سے، جس پر مملکت کا ڈھانچہ استوار ہوا تھا، کبھی روگردانی نہیں کرتے۔

پاکستان میں، جیسا کہ سطور گزشتہ میں بیان کیا گیا، قراردادِ مقاصد ایک اساسی دستاویز کے طور پر مسلمہ ہے۔ اسے پارلیمان کی مکمل تائید وحمایت حاصل ہے اور مقننہ اسے اساسی سرچشمہ قانون (Grund norm) قرار دے چکی ہے۔ اس کے باوجود روشن خیال حضرات اگر اس مقدس دستاویز کو دستور پر بوجھ قرار دیں تو ایسی سوجھ بوجھ کے حامل افراد کو اسرائیلی فکر سے رجوع کرنے کو کہا جاسکتا ہے۔ جس فکر کے تحت ان کی بنیادی اور مقدس دستاویز (اعلان آزادی) دستوری تقاضے بخوبی پورے کررہی ہے۔

ایسے روشن خیال افراد سے بڑی دلسوزی اور محبت سے گزارش ہے کہ وہ اپنی تاریخ اور جڑوں پر نظر دوڑائے محض ندرت خیال کے تعاقب میں قومی اتفاق رائے کے منافی آرا کا اظہار کرتے وقت عوامی جذبات سے نہ کھیلیں۔ ممکن ہے ایسے افراد کی فکر وطن عزیز میں کبھی عملی شکل اختیار کرلے جس کا نتیجہ حاملینِ اتفاق رائے کی طرف سے شدید ردِعمل کی صورت میں آئے گا اور یقیناً کامیابی بھی حاصل کرلے گا۔ لیکن اس عمل میں ریاستی تعمیر وترقی کی بجائے افراتفری کا عمل طول پکڑے گا۔ ہوگا وہی جسے عوام کی غالب اکثریت کی تائید حاصل ہوگی۔

اگر روشن خیال اصحاب فکر یہ مشقِ بے ثمر ترک کرکے یہاں سے ذرا آگے منزل کی طرف سفر کا آغاز کریں تو ملک استحکام حاصل کرے گا۔ امید ہے اصحاب دانش اس پر مزید غور وفکر کریں گے۔

حوالہ جات

1. The Constitution of the Republic of Sri Lanka, Chapter II, article 7(1)
2. The Constituent Assembly of Pakistan Debates, vol.V, No.1, Karachi 1949, p.3
3. Proclamation of Independence, Provisional Government of Israel, Official Gazette No.1, Tel Aviv, 15 May 1948
4. http://www.knesset.gov.il/description/eng/eng_mimshal_yesod.html
5. Proclamation of Independence, ibid
6. The Indian Independence Act 1947, 17 July 1947

۷۔ ملاحظہ ہو، اعلان آزادی کا آخری پیرا بایں الفاظ:

Placing our trust in the Almighty, we affix our signatures to this proclamation at this session of the provisional Council of State, on the soil of the Homeland, in the city of Tel-Aviv, on this Sabbath eve, the 5th day of Iyar, 5708 (14th May, 1948).

۸۔ ملاحظہ ہو، قانون آزادی ہند ۱۹۴۷ء، بحوالہ ۶ مندرجہ بالا

۹۔ ملاحظہ ہو، حوالہ ۴، مندرجہ بالا

۱۰۔ حوالہ ایضاً

۱۱۔ حوالہ ایضاً، ملاحظہ ہو: More about the Proclamation of Independence

۱۲۔ اس ساری بحث کے لیے حوالہ ۴ مندرجہ بالا میں ملاحظہ ہو: The Constitution

۱۳۔ حوالہ ایضاً میں ملاحظہ ہو: The Harari Proposal

۱۴۔ حوالہ ۴ میں ملاحظہ ہو: Basic Laws

۱۵۔ ملاحظہ ہو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء جس کے تحت ۱۹۵۶ء تک ملک چلتا رہا

۱۶۔ ملاحظہ ہو حوالہ مندرجہ بالا ۳

۱۷۔ اس ساری گفتگو کے لیے ملاحظہ ہو: Assembly Debates بحوالہ ۲ مندرجہ بالا

18. Constitutional Decuments of Pakistan, Dr Safdar Mahmood Lahore, 1975, p. 353
19. The Preamble of the Constituion of the Islamic Republic of Pakistan 1962
20. National Assembly of Pakistan Debates, vol.I, 1962, Rawalpindi, 1963, p. 901
21. The National Assembly of Pakistan (Constitution Making) Debates, February 26, 1973, vol. II, No.8, p. 341-2
22. The Revival of the Constitution of 1973 Order, 1985 vide Presidential Order No.14 of 1985
23. PLD 1972 SC 139, Miss Asma Gilani v. Govt. of Punjab p.182

۲۴۔ یہ مشق ایک دفعہ ہو چکی ہے۔ ملاحظہ ہو: PLD 1992 SC 595 لیکن اس کا زیر نظر بحث سے اساسی تعلق نہیں ہے

۲۵۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی، مورخہ ۱۷ اپریل ۲۰۱۰ء، کالم بعنوان ''تخلیقی مسائل کا فن'' از ایاز امیر